نثرِ جوش، ایک مزّین تصنع یا آزادیٔ فکر کی مثال؟

ڈاکٹر انوار احمد*

حماد رسول**

Abstract:

Poetic impact of Josh Malihabadi is stronger,so critics and researchers have not given due importance to his prose,other than his autobiography or occasional remarks of this free thinker emerged out of some interview or reported by his close associate and nourished by the romantic approach of a section of society otherwise shy of expressing its liberal views.In this article both the authors have tried to establish Josh as a prose writer of a style.Striking feature is the combination of objectivity and subjectivity to create an atmosshere to appreciate the delicasies of basic question raised not only the title but the content.Writers have traced some of the rare resources to analyze and make a system of argumentaion out of them.

جوش ملیح آبادی (۱۸۹۸-۱۹۸۲ء) اُن تخلیق کاروں میں سے تھے جن کی نظم ونثر اور اسلوبِ بیان پر ان کی شخصیت اور اسلوبِ حیات کی چھاپ نمایاں ہے، ان کے اس من چاہے امیج کی اٹھان اور پذیرائی کے واضح طور پر دو ادوار ہیں۔ ایک ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ جب ترقی پسندوں کو بھی عافیت اسی میں دکھائی دیتی تھی کہ جوش کا نام انہی کے قائدین کے ساتھ لیا جائے اور دوسرا پاکستان میں ان کی آمد کے بعد کے وہ عشرے جس میں

* صدر نشین مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

** ریسرچ سکالر شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

انھوں نے بعض طاقت وروں کا التفات بھی دیکھا اور وقتی مشکلات بھی۔ جب کبھی جوش ملیح آبادی کے تصورات ِادب اور مقاصد ومحرکاتِ تخلیق کا ذکر آتا ہے تو تربیت یافتہ قاری کو فوراً 'انگارے گروپ' یاد آتا ہے جن کا مقصد ہی ایسی کتاب لکھنا تھا جو ضبط ہو جائے یا قدامت پسندوں کے قلب وذہن پر چھریاں اور آرے چل جائیں (آرے اور چھریاں روزمرے سے مطابقت رکھتا ہے مگر قلب وذہن کی مناسبت سے یہی ترتیب مناسب ہے)۔ جوش کی ایک یادگار نظم 'فتنۂ خانقاہ' کی مرکزی کردار یعنی بنتِ مہر وماہ ایک اعتبار سے جوش کی اپنی تخلیقی شخصیت کا روپ ہے جس کی اشتعال انگیزی کے کارن وہ چاہتے تھے کہ ضمیرِ زہد میں ہر آن کہرام برپا رہے اور ہونٹوں کے لئے مانوس سبھی وِرد ٹوٹ جائیں۔ ان کی شاعری کے رسیا انہیں شاعرِ انقلاب کہتے ہیں۔ سامراج کے خلاف ان کی بلند آہنگ نظموں کا ذکر کرتے ہیں مگر اکثر احساس ہوتا ہے کہ ان کے ہاں نظیر اکبرآبادی اور میر انیس کی طرح نہ صرف ذخیرۂ الفاظ اور پُر شکوہ بیان ہے بلکہ بات کو کہنے کا ڈھنگ بھی، تاہم اس ذخیرۂ الفاظ کے پیچھے وسیع تر انسانی تجربات اور محسوسات کی وہ دنیا سانس لیتی نظر نہیں آتی جیسی ان دو باکمال شاعروں کے ہاں ہے۔

اصل میں جوش ملیح آبادی نظیر اکبرآبادی کی طرح عوامی تخلیق کار نہیں تھے اور نہ انیس کی طرح محسوساتِ انسانی کے نبض شناس۔ انہیں ہمیشہ اہل زبان اشرافیہ کے ایک مخصوص طبقے کی طلب رہی جو مصرعہ اٹھانے کی ساقی گری کر سکے، یا وہ اپنے 'باغیانہ جملوں کی داد، آزادیٔ اظہار کو ترسے ہوئے حکمرانوں کے بعض مقربین سے پا سکیں۔ بلاشبہ قیامِ پاکستان کے بعد کہ بھارت اور پاکستان میں اثاثوں پر افتخار یا مان کے حوالے سے ایک مسابقت تھی اور جوش کے پاکستان آجانے کو اس سرزمین کی ثقافتی فتح قرار دیا گیا۔ تاہم یہ عجیب اتفاق ہے کہ انھوں نے پاکستان میں چلے آنے کے لئے وہ زمانہ منتخب کیا جس کے کچھ عرصے کے بعد جنرل محمد ایوب خان کی دس برس پر محیط حکومت کا آغاز ہو گیا، تاہم یہ وہ وقت تھا کہ ایوب خان کے کم از کم دو رتن بڑے ادیبوں شاعروں کو حکومت کے لئے 'دردِ سر' بننے سے روکنے کے لئے کافی متحرک رہے اور اسی دور میں وہ اردو ڈکشنری بورڈ سے وابستہ رہے، جہاں ان کی انا نے مولوی عبدالحق، شاہد احمد دہلوی اور شان الحق حقی کو بھی قبول نہ کیا اور پھر جو مختصر وقت ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوری حکومت کا آیا، اس میں ان کے مشوروں کی پذیرائی بھی ہوئی، جیسے اکادمی ادبیات کے قیام کے حوالے سے ان سے مشاورت بھی ہوئی، پھر اس دور کا اختتام تب ہوا جب ان کا وہ انٹرویو بھی ان کے گلے کا ہار بن گیا جو ریڈیو پاکستان نے اس وعدے کے ساتھ ریکارڈ کیا تھا کہ اسے ان کی وفات کے بعد نشر کیا جائے گا مگر یہ حقیقت ہے کہ اسی دور میں پاکستان میں آزادیٔ اظہار کو ترسے ہوئے لوگوں نے جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی کے بعض اجزا کی ایک طرح سے تشکیلِ نو کی، بعض محافل میں کہے ہوئے ان کے فقرے یا ان کے مضامین کے جستہ جستہ اقتباسات مجلسوں میں

دہرائے جانے لگے۔

جوش ملیح آبادی کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا، مگر ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی کتاب (’جوش ملیح آبادی، ایک مطالعہ‘) ان کی شخصیت اور فکر و فن کو سمجھنے کے لئے اساسی حوالہ بن گئی ہے، اس لئے اس میں سے چند اقتباسات آغاز میں پیش کر دینا مناسب ہوگا:

’’جوش ملیح آبادی ایک لمحے کے لیے بھی ’ہیرو‘ کے کردار سے رُوگرداں ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں بعض حضرات ساری عمر ’ہیرو‘ کے انداز میں عمل کرتے ہیں اور اس کے لیے ان کے اسلوب نگارش اور اسلوب حیات میں ایک ایسی مطابقت پیدا ہو جاتی ہے جو خود کو ’ہیرو‘ یا ’زندگی‘ کے اسٹیج کا مرکزی کردار المیہ یا طربیہ نہیں سمجھتے اور اس طرح وہ اپنے روزمرہ کے معمولات سے اور انداز زیست میں بہت سمٹے سمٹائے نظر آنے میں بھی یک گونہ مطمئن و خرم نظر آتے ہیں۔ شاید یہ اس لیے ہو کہ زندگی قدم قدم پر خود تصدیق (Self-Validation) رویہ چاہتی ہے۔ انسان اِس ہنر میں خاصہ طاق ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسان اور امید ایک دوسرے کا لازمہ ہیں اور انسان و یاسیت ایک دوسرے کی ضد تھی۔‘‘(۱)

’’یوں لگتا ہے کہ ہماری بیسویں صدی اور خصوصیت کے ساتھ اس کا نصف آخر، مغربی تہذیب کے ردِ عمل میں قرون وسطیٰ کی عرب تہذیبی اقدار و تہذیب کی بازیافت کے لایعنی کام میں گزرا ہے اور وہ بھی معتزلہ فکر کی آزاد فضاؤں کے مقابلے میں اشاعرہ کے تاصبح قیامت سر بمہر بند افکار بلندی کے لیے جس نے ہمیں جدید تہذیب کے دائرہ سے خارج (Drop-out) کر دیا ہے اور کے مدمقابل لا کھڑا کیا ہے۔ جوشؔ کی پسندیدہ فکر کا صحت مند حصہ اکیسویں صدی کے لیے درکار فکری صلابت اور نظری استقامت کے لیے ہنوز زادِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔ اس فکر میں نوع انسانی کے چیدہ چیدہ بزرگ مذہبی اور سیاسی مفکروں کی فکر میں جاری و ساری کہنگی اور فرسودگی کے خلاف احتجاج کی توانا بازگشت ہے اور بازگشت ہی زندگی ہے اور یہی زندگی کی وہ توانائی ہے جس کے بغیر انسانی فکر کا جدلیاتی عمل ایک نقطہ پر آ کر رک جاتا ہے۔ افراد کی طرح انسانی قبائل اور اقوام بھی مفلوج ہو سکتی ہیں۔ خاص طور پر اس لمحہ جب وہ جہد للبقا کی جنگ میں شکست کھا چکی ہوں اور ان کی غیر عقلی جذباتیت غور و فکر اور تحلیل و تجزیہ کی استعداد سے شکست کھا چکی ہو۔‘‘(۲)

’’جوشؔ ایک رومانی شخصیت ہیں حقیقت کو اپنے رنگ میں اور ڈھب سے دیکھنے کے متمنی اور اس طرح ان کے یہاں انیسویں صدی کے نصف آخر کی ’’دنیا‘‘ سنی سنائی دنیا نہ تھی، دیکھی دکھائی دنیا تھی اور اس دنیا میں ابھی تک ایک تہذیب کے ’غروبِ آفتاب‘ کے وقت کی شفق کا وہ رنگ تھا جس کی موقع نگاری بہر طور، ایک التباسِ نظری ہی کی مرقع نگاری تھی۔‘‘(۳)

''جوش صاحب بہ اعتبار فکر 'انقلابی' اور بہ اعتبارِ ہیئت کلاسیکی یا 'روایتی' تھے وہ روایتی طریقہ اظہار جو آج سے ۸۰-۹۰ سال پہلے کے اُردو ڈراموں کے ڈائیلاگ کی یاد دلاتا ہے آج کے نوجوانوں کے لیے قابل تقلید نہ ہو لیکن اس صدی کے شروع دور کی مرصع نثر کی تکرار ضرور ہے جو جوشؔ کے لیے قدرتی اسلوب کی شکل اختیار کر چکا تھا۔'' (۴)

جوش ملیح آبادی کے بعض مداح ان کی قدرتِ کلام، مشاقی اور زبان دانی کے قائل ہیں، بعض ان کے جستہ جستہ خیال افروز فقروں کے سبب انھیں کلچرل ہیرو خیال کرتے ہیں [ایک نامور مولانا کے لئے ان کا وہ فقرہ یاد کیجئے 'اللہ تمہیں اندر سے سنگ سار کر رہا ہے]، بعض ان کی ناز برداری کو ایک پیمانہ خیال کر کے حاکمان و والیانِ ریاست یا محبوبانِ جہان کے ظرف کو جانچنے کا معیار بناتے ہیں [ان کے خلاف شائع ہونے والا 'ساقی' کا جوش نمبر آپ نے دیکھا ہوگا، جو ملامتیوں کی ان سے شیفتگی کو بڑھا دیتا ہے]۔ کچھ ان کے طنطنے، بانکپن اور آزاد خیالی کو لائقِ تحسین خیال کرتے ہیں، لیکن آج ہمارا معاشرہ اپنے نظریہ ساز اشرافیہ کے سبب جن تاریخی، تہذیبی اور فکری تضادات سے گزر کر ایک کم کامیاب یا نحیف کوشش کر رہا ہے کہ دنیا بھر میں پاکستان کا ایک مہذب، روشن خیال اور انسان دوست نقش ابھار سکے، ان کا احساس صرف ممنوعات کی وسیع سے وسیع تر فہرست پر نگاہ ڈالنے سے ہی ہو جاتا ہے۔ تب ہمیں صوفی شاعر اور وہ ملامتی عاشق یاد آتے ہیں جو پاکستان کا حقیقی تہذیبی وثقافتی سرمایہ تھے اور ہیں اور انہیں زیرِ عقوبت رکھا گیا بلکہ درس گاہوں تک کے نصاب سے خارج کر دیا گیا۔ پاکستان کی نامور مورخ عائشہ جلال نے آکسفورڈ پریس اور برٹش کونسل کے تحت کراچی کے کتاب میلے [۲۰۱۲] میں کیا معنی خیز بات اپنے نانا سعادت حسن منٹو کے بارے میں کہی ہے کہ شراب تو سعادت حسن منٹو امرتسر اور ممبئی میں بھی پیتے تھے مگر پاکستان کی ایک مخصوص معاشرتی کیفیت نے انھیں 'شرابی' بنا دیا، گویا انہیں اسی حوالے سے شہرت دی یعنی ہمارا معاشرہ معصوموں پر فردِ جرم عائد کرنے میں لاثانی ہے۔ ماجرا یہ ہے کہ ادیبوں، شاعروں اور تخلیق کاروں کا وہ گروہ جو رندی و سرمستی کو اپنی فکری اساس کا سرچشمہ خیال کرتا ہے وہ کیسے جوش ایسے ملامتی عاشقوں کو اپنا تہذیبی سرمایہ خیال نہیں کر سکتا؟، جب کبھی ہمارے اہلِ عقیدہ کی سمجھ میں ابن العربی کے اس لطیف نکتے کے مفہوم تک رسائی نہیں ہوگی کہ 'جنت کے پھل، دوزخ کی آنچ سے پکتے ہیں' اس وقت تک ملامتی عاشقوں اور تخلیق کاروں کی طرف سے اپنے تہذیب وثقافت میں بنیادی کردار کی اہمیت سمجھ میں نہیں آئے گی۔

جوش ملیح آبادی نے 'یادوں کی بارات' میں خودکشائی کے باب میں لکھا تھا:

''میری زندگی کے چار بنیادی میلانات ہیں، شعر گوئی، عشق بازی، علم طلبی اور انسان دوستی'' (ص ۱۳)

مگر حقیقت میں ان کی ذات کا ایک اور پہلو بھی بہت اہم ہے اور وہ ہے شہ خرچی، سو جہاں انھوں نے الفاظ کی:

''شہ خرچی سے اردو زبان کی ثروت مندی اور بلاغت کی صلاحیت سے اپنے مداحوں کو مبہوت و مرعوب کیا ہے، وہاں ان کے مزاج شناس فراق گورکھپوری نے کہا تھا' کاش ان کا کلام پُر جوش ہونے کے ساتھ ساتھ اتنا ہی خاموش بھی ہوتا، بلند ہونے کے ساتھ اتنا ہی گہرا ہوتا'' (۵)

جوش کی شاعری کے بارے میں بیشتر احباب باتیں کرتے ہیں، مگر ہم ان کی زوردار اور دل فریب نثر کے بارے میں کچھ باتیں عرض کرتے ہیں، جوش کی نثر کا سب سے دلآویز مرقع تو 'یادوں کی برات' ہے، جو ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی مگر مقالاتِ زریں ('اقوال زریں') کے نام سے اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے ۱۹۲۰ء میں ان کی نثر کا نقشِ اول شائع کیا۔ پھر اگلے ہی برس ایک اور کتاب 'اوراقِ سحر' ('حکیمانہ اقوال') اسی ادارے نے شائع کی، جس میں ان کی محبوب صبح کے حوالے سے نظم و نثر کا انتخاب ہے، پھر 'جذباتِ فطرت' کے نام سے اس برس اسی ادارے کی جانب سے کتاب شائع ہوئی جس پر یہ ذیلی عنوان درج ہے 'فطرت سے متعلق مختلف اقوال۔ ماہنامہ 'کلیم' میں شائع ہونے والے مضامین 'اشارات' کے نام سے ۱۹۴۲ء میں نگار بک ایجنسی دہلی نے شائع کئے۔ 'یادوں کی برات' کے بعد ان کی نثر کے جو نمونے ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۳ء تک شائع ہوئے ان میں ڈاکٹر خلیق انجم کی تین مرتبہ کتابیں اور پھر، صفدر حسین، سحر انصاری اور ہلال نقوی کی بھی مرتبہ کتب شامل ہیں، جن میں ان کے مکتوبات اور مضامین ہیں، جیسے 'خطوط۔ نقدِ اخلاص'، مرتبہ: صفدر حسین، 'مکاتیبِ جوش بنام عطرت حسین'، سنگ میل لاہور، ۱۹۷۶ء۔ 'جوش بنام ساغر'، مرتب: خلیق انجم، دہلی: ۱۹۹۱ء۔ 'خطوطِ جوش'، مرتب: خلیق انجم، دہلی ۱۹۹۳ء۔۔ان کے علاوہ جیسے کہ ذکر ہوا، ضیاء الحق دور کے آغاز کے ساتھ ہی 'آوازِ خزانہ' کے لیے ریکارڈ ہونے اور بعد از وفات نشر کرنے کے وعدے کے ساتھ ہونے والے انٹرویو کی صالحانہ اشاعت، جس کی بدولت وہ معتوب ہوئے، مگر آمریت اور ریاکاری کی اس رات میں ان کے اس انٹرویو کے تخلیق جملے منٹو کے افسانوں اور فیض کی نظموں کی طرح بار بار دمکتے رہے۔ اسی لئے ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اپنی محولہ بالا کتاب میں لکھا ہے کہ کراچی میں لطف اللہ خان کے صوتی آرکائیوز میں جوش اور راغب مرادآبادی کے تقریباً ۳۵ گھنٹے کے دورانیے پر محیط وہ ٹیپس بھی موجود ہیں جو آنے والی نسلوں کو جوش کے افکار بزبانِ جوش کے عیشِ سماعت سے بہرہ ور کرتے رہیں گے' (۶) اور یہ بھی لکھا کہ اگر یہ محفوظ شدہ گفتگو کتابی صورت میں آجائے تو شاید شب پرستوں کا ایک قافلہ اسلام آباد کے اس قبرستان کی طرف کوچ شروع کر دے، جہاں جوش مدفن ہیں۔ (۷)

پاکستان میں ایوبی آمریت کی رخصتی صرف ایک حاکم کی رخصتی نہ تھی، بلکہ اس کے ساتھ ایک آئین اور اس کے نورتنوں کا بنایا ہوا سیاسی، فکری اور ثقافتی نظام کا زمیں بوس ہو گیا اور امکان پیدا ہو گیا کہ شاید پہلی مرتبہ اہلِ پاکستان کو آزادی سے اپنے بنیادی مسائل کے تعین اور ان کے حل کے لئے اپنی قیادت کو چُننے کا حق مل جائے گا، اُس وقت بعض سنجیدہ مباحث کا آغاز ہوا، جوش اس موقع پر کوئی منضبط اور مدلل موقف تو پیش نہیں کرتے، البتہ ان کے بعض فقرے کچھ روایتی حلقوں سے رندوں کی چھیڑ چھاڑ کی روایت کی بشاشت کو ابھارتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر جوش کے ایک دلچسپ مضمون کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جو ہفت روزہ 'لیل ونہار' میں ۷ تا ۱۳۔ دسمبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا 'ایلیکشن' جسے اب 'جوش شناسی' میں ڈاکٹر ہلال نقوی نے دوبارہ شائع کیا ہے، [بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ جوش کی مبالغے کی حد تک محتاط املا ہے، جو الیکشن، ایلیکشن ہو گیا] اس میں سے چند جملے دیکھئے:

> ''دونوں گروہوں نے سونے کے چوہے دان بنوائے ہیں، فدائیانِ اسلام نے اپنے چوہے دان کے آنکڑے میں حیاتِ فردا کی شیرمال آویزاں کر دی ہے اور خدّامِ انام نے اپنے چوہے دان میں حیاتِ امروز کی روٹی کا ٹکڑا لٹکا دیا ہے اور یہ دونوں چوہوں کی کھٹکا کے انتظار میں ڈھکی لگائے بیٹھے ہیں'۔(۸)

اسی مضمون کے آخر میں قوم سے اپیل کی ہے کہ ووٹ دیتے وقت ۱۸ باتوں کو ملحوظ رکھیں، ان میں ایک تو یہ کہ اس [امیدوار] کی معاش کس چیز پر مبنی ہے؟ اور اہم ترین یہ کہ اس نے جوانی میں کبھی دل لگایا ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ اعلیٰ قسم کی اور پختہ لیکن سستی شراب کشید کرنے کے واسطے بھٹیاں قائم اور ایسے افراد کے نام اجازت نامے جاری کرے، جو صحتِ جسمانی، سلامتی عقل اور شرافتِ نفس کی بناء پر بادہ خواری کی اہلیت رکھتے ہیں'۔ (۹)

اپنے خیالات کے بے دھڑک اظہار پر جوش کی مدح سرائی بھی ہوئی اور مذمت بھی، مگر ایک آدھ عالم کے سوا، ان کے ادبی آثار کو مرتب کرنے کی کوئی منظّم کوشش نہ ہوئی، کوئی بیس برس پہلے ایک کتاب 'جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں' ڈاکٹر ہلال نقوی نے مرتب کی تھی، جسے ۲۰۱۰ء میں 'اوراقِ جوش' کے نام سے مرتب نے کچھ اضافوں کے ساتھ اظہار سنز، لاہور نے شائع کرایا ہے۔ 'اوراقِ جوش' کے مرتب نے بجا طور پر لکھا ہے:

> ''.....گھر کے گملے میں چنبیلی کے پودے کو پانی دینے سے لے کر موت کی خزاں رسیدگی پر اظہارِ تاسف تک ان کے اطوار، گفتار اور کردار کے کتنے ہی چلتے پھرتے منظر اب بھی آنکھوں کے کیمرے میں محفوظ ہیں۔.....دوسرے میں نے اس بارے میں جوش صاحب کی 'بے خبریاں' خود بھی دیکھی تھیں گنبد والے مکان کے پہلے فلور سے اترتے ہوئے زینے کے نیچے گرتج نما حصے میں ایک پھٹی ہوئی بوسیدہ اٹیچی میں ان کے قیمتی ادبی نوادارات تباہی کی نذر ہو رہے تھے'(۱۰)

جوش کی طباعی، ذخیرۂ الفاظ، ڈرامائیت [خاص طور پر اپنے مخاطب کو صدمہ پہنچانے کی صلاحیت] اور مسلّمات کو باآوازِ بلند مسترد کرنے اور اپنے اظہار کے آہنگ سے لطف اندوز ہونے کا وصف ان کی نثر کا خاصہ ہے، مگر کسی بھی موضوع پر ترتیب و تنظیم سے کام نہ کو سکے اس لئے ان کی تحریروں میں کچھ فقرے ہیں، جو ضرب الامثال بھی بن سکتے ہیں، بے ساختہ داد و تحسین بھی سمیٹتے ہیں، مگر ہیں تو وہ مفرد فقرے، جوش کی اس کتاب [اوراقِ جوش] اور دیگر تحریروں میں سے چند اقتباسات دیکھئے:

''جب شاعر الفاظ کو ان کے معروف لغوی معنی سے علیحدہ کر کے استعمال کرتا اور انھیں جدید معنی کا خلعت پہناتا ہے تو لغات و لغات نویس دونوں کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے کہ آخر یہ ہوا کیا' (۱۱)

''جب تک شادی نہ ہو، معشوقہ مجمل نشیں لیلیٰ ہوتی ہے اور شادی کے بعد وہ انگنائی میں بندھی ہوئی گائے میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے'۔ (۱۲)

''جب تک آدمی حجاج، ہلاکو، چنگیز، نادر، نیرو، ابن زیاد اور یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کر لیتا، سرمایہ دار و صنعت کار بن ہی نہیں سکتا۔'' (۱۳)

'میَں نے پاکستان کے ایک شاندار منسٹر صاحب کو اردو میں خط لکھا، اور ان صاحب بہادر نے انگریزی میں جواب مرحمت فرمایا تو میَں نے جواب الجواب میں یہ لکھا تھا، تو میَں نے جواب الجواب میں یہ لکھا تھا کہ جنابِ والا، میَں نے تو آپ کو اپنی مادری زبان میں خط لکھا لیکن آپ نے اس کا جواب اپنی پدری زبان میں تحریر فرمایا ہے۔'' (ص۱۴)

''اقوال و اساطیر نے ہماری عقل کا گھلا گھونٹ رکھا ہے اور ہمارے دماغ کو ایک ایسے ڈھرے پر ڈال دیا ہے کہ ہم، بے بنیاد ایقان کو اوڑھنا، بچھونا بنا چکے اور عقاید کا دودھ پی پی کر، تجسس و تحقیق کو ایک شیطانی عمل سمجھنے لگے ہیں، ان خرافات کے جادو گھر سے، انسان کا نکالنا سب سے بڑا شرف و مجد ہے'۔ (۱۵)

اپنے معاصرین کی شخصیتوں کے بارے میں جوش کے تبصرے صرف دل چسپ ہی نہیں بلکہ ان کے مصلحت سوز مزاج کے سبب معنی خیز بھی محسوس ہوتے ہیں، واضح رہے کہ فانی کے بارے میں 'یادوں کی برات' میں بھی لکھا گیا، مگر بعد میں ایک مضمون میں کچھ اور معلومات کو اس میں شامل کیا گیا، خاص طور پر اس حصے کو

''فانی کی زندگی کا آخری زمانہ اپنے دوستوں سے بدگماں رہنے کا ایک مستقل و مسلسل دور تھا۔.....ان کے کمرے میں جب کوئی مچھر داخل ہوتا ہے تو وہ سمجھتے تھے کہ میرے فلاں دوست نے اس مچھر کو میری طرف اس لیے روانہ کیا ہے کہ وہ مجھ کو کاٹ کر ملیریا میں گرفتار کر دے'۔ (۱۶)

''(مولوی وحید الدین سلیم کے بارے میں) ''کوڑی کوڑی کر کے جب تیس چالیس ہزار روپے جمع کر لیے تو ان کی موت آ گئی، وہ تمام دولت ان کی اکلوتی بیٹی کو ملی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا وہ

تمام روپیہ ان کا مولوی داماد نمازیں پڑھ پڑھ کر ہضم کر گیا ..... ملحد ڈھول بنائے اور اسے ملاّ بجائے۔''(۱۷)

''ایک روز میر بارق صاحب ایک محفل میں ملے پوچھنے لگے میاں اب کس محلے میں قیام ہے میں نے کہا''لاٹوش روڈ پر'' ہے! میر صاحب نے چھاتی پیٹ کر کہا''ارم تم اتنے خوش گو شاعر ہو کر ایک ایسی خبیث سڑک پر رہتے ہو جس میں (ٹ) اور (ڈ) کے حروفِ ثقیلہ پائے جاتے ہیں! میرے منہ سے تو اس نامراد سڑک کا نام تک نہیں نکل سکتا۔ اگر خاں صاحب زندہ ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ ان حروفِ ثقیلہ میں کبھی قیام نہ فرماتے میاں جب تک اس محلے میں رہو گے ہم کبھی ملنے نہیں آئیں گے۔(۱۸)

'فرنگیوں کے خطاب یافتہ خادم حفیظ جالندھری' ____ 'احمد فراز کے سے نابالغ انسان سے رائے مانگی'۔۔۔'فیض ہر چند نہایت آب دار شعر کہتے ہیں لیکن اس قدر بُری طرح پڑھتے ہیں کہ سارا مزا کرکرا ہو کر رہ جاتا ہے۔(۱۹)

اس سلسلے میں تو کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی کہ خود سے وہ بہت محبت کرتے تھے، مگر اپنے بارے میں تنقیدی تبصروں کے بھی شائق ہیں، مگر ظاہر ہے کہ اپنے بارے میں وہ خود کو بھی بہت زیادہ 'منہ پھٹ' ہونے کی اجازت نہیں دیتے:

.....'میری شخصیت شبیر حسن خان اور جوشؔ ملیح آبادی کے درمیان بٹی ہوئی ہے، شبیر حسن خان حکمت کے پجاری ہیں، لیکن جوش ملیح آبادی افسانۂ وافسوس کا دلدادہ ہے'۔۔۔''میرے سے برہنہ گفتار آدمی پر دنیا کی کوئی حکومت کبھی مہربان ہو ہی نہیں سکتی حکومتیں مہربان ہوتی ہیں بے ضمیروں پر۔ میرے پاس ضمیر جیسی خطرناک چیز موجود ہے۔''(۲۰)

جوش کے جوشِ خطابت کی بدولت ان کا فکری پہلو دب سا گیا، مگر جہاں کہیں انہیں مربوط انداز میں بات کرنے کا موقعہ ملا، یا ان سے فرمائش کی گئی کہ وہ اکادمی ادبیات کے قیام کے حوالے سے سفارشات پیش کریں، یا موجودہ فکری انجماد یا عالمگیر انسانی اقدار کے بارے میں بات کریں، تو ان کے بے دھڑک اور مرصع اسلوب کی اپنی گمراہ کن کشش کے باوجود انہوں نے اپنے عالم ہونے کا تاثر ہی دیا:

''صحائف، نقش بہ دیوار ہیں، اور فلاسفہ سرمہ در گلو۔ آخر کس سے دریافت کیا جائے؟ کس سے پوچھا جائے؟ کس ماں نے آج تک کسی جاننے والے کو جنا ہے؟ ہر طرف کامل خاموشی، زبردست، سکوت، اور اتھاہ سناٹا ہے۔ اور غریب انسان، مشیت کا سوتیلا بیٹا انسان، 'کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ مارا، کارونا روتا ہوا تحقیق کی تاریک و ناہموار وادیوں میں سر پھوڑتا پھر رہا ہے اور ہر منزل، ہر قدم پر 'معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شُد' کی دردناک چیخ اس کی زبان سے نکل جاتی ہے۔ وائے اے ذوقِ تحقیق! حیف اے دردمند انسانیت!(۲۱)

''مغرب نے جدت پسندی اور عقل فروزی کو اپنا شعار بنا لیا اور مشرق نے قدامت پرستی اور عقل سوزی کی عبا دوش پر ڈال لی۔ مغرب نے ترقی کرتے کرتے اپنے سوزوں پر جوہری توانائی کا خیمہ نصب کر لیا اور مشرق نے تنزل کرتے کرتے ناتوانی کے بوریے پر اپنی سانس لیتی ہوئی لاش گرا دی۔...... وہاں ترقی کے راستے کھل گئے، یہاں ترقی کا در مسدود ہو گیا، وہاں نئی نئی ایجادیں ہونے لگیں، یہاں پرانی دہرائی داستانیں دہرائی جانے لگیں، وہاں تعقل و تعبد کو ہم معنی کر دیا گیا یہاں عقلیت و ابلیسیت کو ہم زلف قرار دیا گیا، وہاں یہ سمجھا گیا کہ ارتقاء کے فیضان سے انسانی ذہن روز بروز بلند سے بلند تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور ماضی کے سر بہ فلک قلعے آج بچوں کے گھروندے کی مانند ہیں۔ یہاں یہ سمجھ لیا گیا کہ انسانی ذہن تنزل کی نحوست سے روز بروز پست سے پست تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور اسی بناء پر ماضی کے گھروندے آج قلعے نظر آ رہے ہیں۔ یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ تحقیق و تدقیق کی معرفت راہ نمائی کا حق صرف ماضی کو حاصل تھا اور مستقبل کا لے دے کر صرف یہ ایک فریضہ رہ گیا ہے کہ وہ ماضی کا طوقِ غلامی پہن کر ایک وفادار کتے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلے'۔(۲۲)

''ذرا اپنے 'شعرائے کرام' کے تخلص ہی ملاحظہ فرما لیجیے اور کسی ماہر نفسیات سے دریافت فرمائیے کہ یہ تخلص کسی نوع کی ذہنیت پیش کرتے ہیں، آپ جانتے ہیں اس کا جواب کیا ہوگا؟ وہ غیر مشتبہ الفاظ میں بتا دے گا کہ اس نوع کے تخلص صرف وہی لوگ پسند اور اختیار کر سکتے ہیں جن کے ولولوں کی کمریں ٹوٹ چکیں اور جن کی ہمتوں کے منکے ڈھل چکے ہیں۔ سنیے اور عبرت کے کانوں سے سنیے۔ مجروح، تفتہ، ملول، مسکین، درد، سوز، ذرہ، تخچیر، داغ، افسوس، حزیں، عدم، بیدم، بسمل، کشتہ، الم، اشک، آہ، قلق اور یاس وغیرہ۔ اور لگے ہاتھوں ان شعراء کے کلام سے متاثر ہونے والے ادیبوں کے ان سابقوں کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو وہ بالعموم خطوں میں اپنے ناموں کے ساتھ لکھتے ہیں، ناچیز، ذلیل، فقیر، احقر، رسوا، کمترین، فدوی، عبدِ ذلیل، ہیچ میرز، بندۂ بےنوا، کمترین، خلائق، ارذلِ مخلوق، احقر العباد، عاجز، ہیچمداں، گناہگار، عاصی، پُر معاصی اور روسیاہ وغیرہ۔ کیا آپ اپنے شاعروں اور ادیبوں کی پست ذہنیت کے سمجھنے کے لیے اس سے زیادہ کسی ثبوت یا شہادت کے طلب گار ہیں؟ (ص۲۳)

......' شاعری عقل کا راستہ اختیار کرے گی تو پنپے گی، ورنہ مر جائے گی'۔...... 'ہمیں یہ عزم بھی کر لینا چاہیے کہ ہم اپنے زبان کی سکڑاہٹ اور اپنے افکار کی بھچاوٹ سے اب دیر تک صلح نہیں کریں گے اور اس سے اعلانِ جنگ کر کے آگے بڑھ جائیں گے۔ یہ اعلان جنگ اس طرح ہو سکتا ہے کہ تعلیم کو عام کیا جائے، نصاب ایسا مرتب کیا جائے جو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ دارالترجمہ و دارالتصنیف قائم کیے جائیں، آکسفورڈ ڈکشنری کے معیار کی فرہنگ مدون کی جائے، جدید الفاظ، اسماء و محاوارت، مرکبات اور ضرب الامثال کی تسکیک کے واسطے ایک لسانی دار الضرب قائم کی جائے اور اخباروں، رسالوں، لیکچروں، فلموں اور ریڈیو کی وساطت سے جدید الفاظ و افکار کو

مستقل و مسلسل نشر کیا جائے۔اس کے ساتھ ساتھ نہایت وسیع پیمانے پر کتب خانے قائم کیے جائیں، اقطاب علم و امامان ادب کو فکر معاش سے قطعی طور پر آزاد کر کے تخلیقی کارناموں کی فرحت بخشی جائے اور ان کی کتابوں کا معقول بندوبست کیا جائے۔.....ہم محسوس کر سکیں کہ ہماری زبان کس قدر تنگ و محدود ہے اور تو اور ہماری زبان میں تمام جانوروں، تمام درختوں، تمام پھولوں اور تمام جڑی بوٹیوں وغیرہ کے نام نہیں ہیں، جانداروں کے بچوں اور ان کی بولیوں کے بھی نام نہیں ہیں۔علم الحقائق کا تو ذکر ہی کیا، ہماری زبان میں علم الاسماء بھی شرم ناک حد تک محدود ہے'۔.....الفاظ کو کاغذ پر روشنائی کی لکیریں نہ سمجھو، وہ تو بے جان لکیریں ہیں، نہ ہوا کی گرہیں۔الفاظ تو ذی حیات ہیں۔انسانوں کی طرح روحِ ذی حیات'۔۔(۲۴)

'آپ اکاڈمی کا مقصد دریافت کرنا چاہتے ہیں، سو، بندہ پرور اس کا مقصد، انقباضِ جہل وانشراحِ علم کے سوا، اور کیا ہوسکتا ہے۔اس مقصد کے حصول کی خاطر، فلموں ڈراموں، رسالوں، کتب خانوں، درسگاہوں، مقالوں، جلسوں، تصنیفوں، تالیفوں اور ترجموں سے کام لیا جاسکتا ہے'۔(۲۵)

لطف یہ ہے کہ موخرالذکر اقتباس ذہین بابا تاجی کے نام جوش کے مکتوب سے لیا گیا ہے، جسے راغب مرادآبادی نے مرتب کیا، اس مجموعے میں جوش کے حسنِ عقیدت کے باوجود اک گونہ چھیڑ چھاڑ موجود ہے، جو ذہین بابا تاجی کی وسیع القلبی کو بھی ظاہر کرتی ہے، جوش کی شاعرانہ یارندانہ سرمستی کی تو مظہر ہے ہی،

''آپ پانی بھری بوتلوں پر دم فرماتے ہیں، مَیں آگ بھرے ساغروں پر دم دیتا ہوں، آپ کے ہات میں صبحِ صد دانہ اور میرے ہات میں زلفِ جانانہ ہے، آپ کے گرد پیش، مریدوں کی سانسیں ہیں، میرے سینے میں کچی جوانیوں کے انفاس کی پھانسیں ہیں، الغرض، ایک شے بھی مشترک نہیں ہمارے درمیان، پھر بھی میرا دل آپ کی طرف کھنچتا ہے'(۲۶)

اگرچہ رشید حسن خاں نے جوش کی 'یادوں کی برات' کے بارے میں کہا تھا[جس کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے جوش کا نفسیاتی مطالعہ، جیسی کتاب لکھی] تاہم یہ مجموعی طور پر جوش کی تحریروں کی 'نارسائی' کو ظاہر کرتی ہے اور اس کے بنیادی سبب کو بھی:

''بہت سی معلومات حاصل کرنے کے باوجود ہم جوش سے قریب نہیں ہو پاتے، پوری کتاب پڑھنے کے بعد یہی محسوس ہوتا ہے کہ شاعر ہم سے کچھ دور ایک بلند ٹیلے پر کھڑا رہا ہے، اس نے بہت کچھ کہا ہے مگر سب کچھ نہیں کہا۔اس کتاب میں یہ بھی مقامات ہیں کہ وہاں جو کچھ لکھا ہے وہ یا تو ہے نہیں یا پھر ادھورا ہے۔مزے کی بات ہے کہ جھوٹ بھی ہوتا ہے تو اس انداز سے اور ایسے تیوروں سے کہ سچ معلوم ہونے لگتا ہے۔(۲۷)

حوالہ جات

۱۔ 'جوش ملیح آبادی ایک مطالعہ' ص:۱۴۲

۲۔ ایضاً ص:۱۳۶

۳۔ ایضاً ص:۱۴۵

۴۔ ایضاً ص:۱۴۶

۵۔ 'فراق شاعر اور شخص' ترتیب و انتخاب شمیم حنفی، لاہور ۱۹۸۳ء، ص ۲۱۰

۶۔۷۔ 'جوش ملیح آبادی ایک مطالعہ' ص:۱۴۲

۸۔ 'جوش شناسی' [مرتب: ڈاکٹر ہلال نقوی] ص:۸۵، ۸۶]

۹۔ ایضاً، ص:۸۹

۱۰۔ 'اوراقِ جوش' اظہار سنز لاہور، ۲۰۱۰، ص:۱۰

۱۱۔ ایضاً، 'الفاظ اور شاعر'، ص ۱۸

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ 'یادوں کی برات'، مکتبۂ شعر و ادب، لاہور، ۱۹۷۵، ص:۲۳

۱۴۔ ایضاً، ص:۵۱۶

۱۵۔ راغب مراد آبادی۔ [مرتب] 'خطوط جوش ملیح آبادی'، کراچی، ۱۹۹۸ ص:۵۰

۱۶۔ 'اوراقِ جوش'، ص:۱۷۷

۱۷۔ 'یادوں کی برات'، ص ۵۵۳

۱۸۔ 'اوراقِ جوش'، ص:۱۳۲

۱۹۔ 'یادوں کی برات' ص:۵۳۷)

۲۰۔ ایضاً، ص، ۲۹۹

۲۱۔ فرخ جمال ملیح آبادی 'جوش: میرے بابا؛ اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت، پورب اکادمی، اسلام آباد، ص:۱۳۰

۲۲۔ ایضاً، 'اگر خودکشی کا عزم نہیں فرما لیا ہے' ص:۱۴۵

۲۳۔ ایضاً، 'اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت' ص:۱۳۵، ۱۳۶

۲۴۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، [مرتب] 'جوش شناسی' کراچی، ص:۴۴
۲۵۔ راغب مرادآبادی [مرتب] 'خطوط جوش ملیح آبادی' ص:۵۰
۲۶۔ ایضاً، ص:۳۰
۲۷۔ قمر رئیس [مرتب] 'جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ' 'جوش بہ حیثیت انشاء پرداز، از رشید حسن خان، دہلی ۱۹۹۳، ص:۲۸۸

❁❁❁